پرویز احمد کمبوہ*

اُردو افسانے کی روایت اور "انگارے" کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

THE TRADITION OF THE URDU SHORT STORY AND A CRITICAL EVALUATION OF THE SHORT STORY COLLECTION *ANGAAREY*

Abstract: *No literary genre develops overnight; it evolves over centuries, influenced by social, political, economic, and psychological factors, as well as literary traditions. In the history of Urdu fiction, a turning point came with the publication of "Angaare" in 1932. This collection, featuring works by Sajjad Zaheer, Rashid Jahan, Mahmood-uz-Zafar, and Ahmed Ali, marked a radical shift in Urdu fiction by introducing themes of social and religious criticism, psychological depth, sexual repression, and revolutionary romanticism. Influenced by Marxism, Freudian psychology, and modernist techniques of writers like James Joyce, Angaare opened a new chapter in Urdu literary expression.*

Keywords: Urdu fiction,sajjad Zaheer, Angaare, Rashid Jahan, Ahmed Ali.

تلخیص: کوئی ادبی صنف ایک دن میں وجود میں نہیں آتی، بلکہ یہ صدیوں کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے، جس پر سماجی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی عوامل اور ادبی روایات اثر انداز ہوتے ہیں۔ اردو افسانے کی تاریخ میں ایک اہم موڑ 1932 میں "انگارے" کی اشاعت کے ساتھ آیا۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، محمود الزفر اور احمد علی کے افسانے شامل تھے، جنہوں نے اردو افسانے کو ایک انقلابی، نفسیاتی اور سماجی شعور پر مبنی نیا رخ دیا۔

"انگارے" میں سماجی و مذہبی تنقید، جنسی گھٹن، انقلابی رومانویت اور نفسیاتی گہرائی جیسے موضوعات کو اجاگر کیا گیا۔ ان تحریروں پر مارکسزم، فرائڈ کے نفسیاتی نظریات اور جیمز جوائس جیسے مغربی جدید مصنفین کے اسلوب کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ انگارے نے اردو فکشن کے لیے ایک نیا باب کھولا جو آج بھی اس کی فکری بنیادوں میں شامل ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو افسانہ، سجاد ظہیر، انگارے، رشید جہاں، احمد علی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ افسانے کا آغاز مغرب سے ہوا اور انگریزی میں اسے Short Story کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گو کہ انیسویں صدی سے ہی افسانہ مشرق میں پڑھا جانے لگا لیکن اُردو ادب میں اس کا باقاعدہ آغاز اور ارتقاء بیسویں صدی میں ہوا۔ تاہم برصغیر میں اُردو افسانے کی روایت داستان، حکایت اور قصے کہانی وغیرہ کے روپ میں بہت پہلے سے موجود نظر آتی ہے۔ اس میں بہت سی

* صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ غلام ربانی آگرو کالج، کنڈیارو۔

چیزیں ایسی تھیں جو کہ مغربی افسانے سے مماثلت رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں برصغیر و مشرق میں ارتقاء پذیر ہونے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ طارق چھتاری اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "یوں تو افسانے کے خدوخال علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے زمانے سے ہی نظر آنے لگتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی جڑیں ہمارے یہاں بہت پہلے سے موجود تھیں۔ داستانوں میں کچھ حصے ایسے ملتے ہیں جو علیحدہ سے مکمل افسانے ہیں۔ کردار نگاری، منظر نگاری، کہانی پن اور واقعات کی ترتیب جیسے عناصر آج افسانے کے لئے جز ولازم ہیں، داستانوں سے ہی ماخوذ ہیں۔"(۱)

جب کہ بقول پروفیسر وقار عظیم: "فسانہ آزاد اور باغ و بہار کے بعض اجزا کو الگ کر کے دیکھا جائے تو ان کے اندر بعض جگہ مختصر افسانہ چھپا ہوا نظر آئے گا۔"(۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانوی ادب کو باقاعدہ طور پر ترقی کرنے کے لیے سمت اور رفتار عطا کرنے میں داستانوں کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ اُردو افسانے نے زبان و بیاں کے اعتبار سے داستانوں سے بے حد استفادہ حاصل کیا۔

کسی بھی صنفِ ادب کی تخلیق ایک دن میں نہیں ہوتی یہ صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں تمام خارجی و داخلی عوامل و محرکات، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات، انسان کے جبلی تقاضے اور پھر اس کے ساتھ ہی ادبی روایتیں بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ سماجی حالات اور جبلی تقاضے ضرورت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ ادبی روایتیں اس احساس کو عملی شکل دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس لیے کسی صنف ادب کی ماہیئت پر غور کرتے ہوئے اس کے پسِ منظر کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی چوں کہ مختصر افسانہ فنی چمن بندی میں منظوم و منثور داستانوں کا بھی حصہ ہے اور ناول کا بھی اس لیے سماجی اور معاشی حالات نے جو کروٹیں لیں ہیں اور ان کا جو اثر ادبیات کے مزاج اور موضوعات پر پڑا ہے۔ ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان اصناف کی روایتوں کو نمایاں کیے بغیر افسانے کی حقیقت کو سمجھنا بے حد مشکل امر ہے۔ گو کہ اُردو افسانے کا باقاعدہ مکمل آغاز برصغیر میں بیسویں صدی سے ہوا تاہم اُردو افسانے کے اولین اثرات انیسویں صدی سے ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی برصغیر و ہند میں سیاسی، سماجی، اور معاشی لحاظ سے نئے نئے تغیرات اور تحریکات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دوران بہت سی مذہبی اور اصلاحی تحریکیں سرگرمِ عمل تھیں اور ملک غلامی کی زنجیروں کے خاتمے کے لیے مکمل طور پر کوشاں تھا۔ لہٰذا ان تحریکوں کا اثر اُردو ادب پر بھی ہوا اُردو افسانہ اپنے دور کی عکاسی کرتے ہوئے زندگی کا ترجمان بن کر اُبھرا۔ اس بارے میں وقار عظیم اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں نے جتنی کتابیں ہندی اور فارسی سے اُردو میں منتقل کی ہیں ان کا سلسلہ باغ اُردو کو چھوڑ کر سنسکرت سے ملتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان کے اسلوب فکر و انداز تخیل پر قدیم ہندوستانی

تہذیب اور معاشرتی و اخلاقی اقدار کا رنگ چڑھا ہوا ہے، زبان و بیان کی سادگی ان سب مجموعوں میں دوسری مشترک خصوصیت ہے۔ لیکن اس مشترک خصوصیت میں بھی ترجمہ کرنے والوں کے مزاج اور مذاق کے فرق نے بعض ہلکے ہلکے فرق پیدا کیے ہیں۔"(۳)

اُردو ادب میں روایتوں کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ادب کا ارتقاء بھی روایتوں پر ہی ہوتا ہے۔ نئے حالات، نئے تصورات اور نئے نظریات ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں صورت و معنی میں نئے نقش و نگار ابھرتے ہیں اور کبھی کبھی نئی تحریکیں بھی اُبھرتی ہیں جس سے پورا ادب نئے سانچوں میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن تبدیلیاں خواہ ادنیٰ ہوں یا عظیم ان کی تہوں میں روایتوں کا اثر برقرار رہتا ہے۔ اور اس کی رگوں میں روایتوں کا خون دوڑتا رہتا ہے۔

پس تخلیقی شعور کبھی بھی روایتوں سے اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتا کیونکہ روایتیں شعور کا ہی ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اس لیے نئے ادب اور اس کی تبدیلیوں کو ہمیشہ روایت کے تسلسل کے پسِ منظر میں دیکھنا چاہئے۔ اسی لیے اُردو افسانے پر غور کرتے ہوئے بھی ان روایتوں کے تسلسل کو مدِ نظر رکھنا بے حد اہم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانہ ایک جدید صنف ہے جو کہ برصغیر میں مغرب کے ذریعے سے آئی ہے اس لیے ان کی تکنیک کے تعین میں فطری طور پر مغربی روایت کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ تاہم مشرقی قصوں کی روایتوں نے بھی ان پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ نتیجتاً افسانہ کی مغربی تکنیک پر مشرقی قصوں کے اثرات باآسانی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اُردو افسانے کا آغاز تو بیسویں صدی میں ہوا تاہم اس کا پہلا موجد کون ہے اس حوالے سے ناقدین کی رائے ایک دوسرے سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ بعض مؤرخین کے خیال میں اُردو افسانے کے بانی منشی پریم چند ہیں کیونکہ ان سے قبل افسانے کا مکمل کوئی رواج موجود نہیں تھا۔ جبکہ کچھ لوگوں کے خیال میں سجاد حیدر یلدرم نے افسانے منشی پریم چند سے پہلے قلم بند کیے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری بیان کرتے ہیں۔

"اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند نہیں، سجاد حیدر یلدرم ہیں اور اردو کا پہلا افسانہ پریم چند کا 'انمول رتن' نہیں بلکہ یلدرم کا 'نشہ کی پہلی ترنگ' ہے اس لیے کہ خود پریم چند کے بیان کے مطابق ان کا پہلا افسانہ "زمانہ" ۱۹۰۷ میں شائع ہوا ہے۔ لیکن اس سے سات سال پہلے یلدرم کا افسانہ معارف علی گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۰۰ میں موجود ہے۔"(۴)

ڈاکٹر قمر رئیس کا خیال ہے کہ یلدرم سے پہلے بھی کئی افسانہ نگار ہیں جن کے انشائیوں کو ہم افسانہ کہہ سکتے ہیں۔

"پریم چند کو اردو مختصر افسانے کا بانی کہنا درست نہیں ہے۔ مختصر افسانے کے نمونے ان سے بہت قبل دل گداز، اودھ پنچ، معارف علی گڑھ، ماہنامہ خاتون، خدنگ نظر، مخزن الناظر، بیسویں صدی لاہور اور دوسرے رسائل میں

ملتے ہیں۔ پریم چند نے پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن ۱۹۰۶ میں لکھا جب کہ سید علی محمد شکیل کی کہانی "اے صبا آرزو کہ خاک شدہ دلگداز اکتوبر ۱۸۸۸ میں، سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ معارف علی گڑھ اگست ۱۹۰۰ میں، اور علی محمد بانکی پور کا افسانہ ایک پرانی دیوار مخزن اپریل 1904 میں شائع ہوئے۔"(۵)

تاہم جب مجموعی طور پر اس وقت کے افسانہ نگاروں کا موازنہ کرتے ہیں تو فن اور موضوع دونوں صورتوں میں ہی پریم چند کا قد زیادہ بلند نظر آتا ہے، کیونکہ پریم چند وہ پہلے انسان ہیں جنھوں نے اُردو افسانے کو زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کروایا اس کے ساتھ ہی افسانے کو مضبوط اور مستحکم حقیقت پسندی کی بنیاد مہیا کی۔ پریم چند نے اُردو افسانے کے خدوکال کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اسے زندگی کے دُکھ، درد اور مسائل کی عکاس بھی ظاہر کیا۔ اس کے علاوہ اُردو افسانے میں پریم چند کی مقبولیت اور اوّلیت کی خاص وجہ ان کی قومی جذبات، وسیع و عریض سماجی اور معاشی تبدیلی اور لوگوں کے ذہنی دباؤ کی ترجمانی ہے۔ لہٰذا آپ کے آغاز میں لکھے جانے والے افسانوں کی فضا داستانی ہے۔

جیسا کہ پریم چند کے افسانے "دنیا کا سب سے انمول رتن"، "شیخ مخمور"، یا دیگر ابتدائی دور کے افسانوں پر شعریت اور رنگینیت کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ یوں کہہ لیں کے پریم چند کے افسانوں میں بھی حاتم طائی کے قصوں کی طرح ماورائی اور طلسمی فضا نظر آتی ہے جبکہ آپ کا اندازِ بیان رمزیہ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں۔

"یقیناً پریم چند کی اس زمانے کی زبان بناوٹی ہے۔ سرشار کے اثر سے بوجھل ہے۔ اس میں ایک داستانی فضا ہے۔ شعریت اور رنگینی ہے، جن سب باتوں سے بعد میں انھوں نے چھٹکارہ حاصل کر لیا۔ یہ ساری کی ساری چیزیں ان کے ابتدائی افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے کہنے کا ڈھنگ بھی کم و بیش وہ ہے جو حاتم طائی کے قصوں میں پایا جاتا ہے یعنی قصوں کو دلچسپ بنانے کے لیے اس کے اندر ایک رمزیہ انداز، ایک طلسمی فضا دینا جو عام طور پر حقیقت کی حیثیت سے ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے لیکن ان کا بنیادی تصور حب وطن اور ہندوستان کی تمدنی اور آزادی کی جدوجہد کی تصویر کشی ہے جو ابتدائی شکل میں تھی۔"(۶)

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے کا بنیادی مقصد حُب الوطنی، سیاسی بیداری اور ہندوستان کی تمدنی اور آزادی کی جدوجہد کی تصویر واضح کرنا تھا۔ جس کی وجہ سے انگریز حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی تھی۔ افسانوی مجموعہ "سوز وطن" کے افسانوں کے مطالعے سے ان میں داستانی اسلوب واضح طور پر نظر آتا ہے۔

اسی طرح سے ۱۹۱۰ء میں ''بے غرض محسن'' اور ''بڑے گھر کی بیٹی'' لکھ کر انھوں نے ادب کی تمام روایتی بندشوں کو توڑتے ہوئے داستانی طرز کو پیچھے چھوڑ کر حقیقت نگاری کو اپنے ادبی اور تخلیقی اظہار کا طریقہ بنایا۔ پریم چند نے اس دور میں کئی ایسے افسانے لکھے جن کا مقصد گاؤں کے کسانوں اور محنت کش طبقے کے مسائل کا حل ڈھونڈنا تھا۔

اس مقصد کے لیے پریم چند نے سادہ زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا تاکہ لوگ اسے باآسانی سمجھ سکیں۔ آپ نے کسانوں کی زندگی میں پیش آنے والی کھردری حقیقتوں، متوسط طبقہ اور دیہاتوں کی معاشی و سماجی ترجمانی اپنے افسانوں میں بڑے پُر اثر طریقے سے کی۔ اس حوالے سے آپ کے بہترین افسانے ''کفن''، ''زیور کا ڈبہ''، ''نمک کا داروغہ''، ''دو بیل''، ''قاتل کی ماں''، ''نئی بیوی''، ''حسرت''، ''عید گاہ''، ''خون سفید''، ''صرف ایک آواز''، ''پوس کی رات''، ''مجبوری'' اور دیگر شامل ہیں۔

اُردو ادب میں پریم چند کے بعد اُردو افسانہ کو حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کے جس فن سے روشناس کروایا اس روایت کو آگے بڑھانے والوں میں سدرشن، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے نام بے حد اہم اور نمایاں ہیں۔ سدرشن نے پریم چند کے نقش پا پر چلتے ہوئے انسان کے جذبات اور احساسات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ تاہم ان دونوں کے افسانوں میں ایک بڑا فرق علاقے کا تھا پریم چند نے اپنے افسانوں کا پس منظر دیہات رکھا۔ جب کہ سدرشن نے شہروں میں رہنے والے متوسط ہندو گھرانوں کے مسائل کو موضوع بناتے ہوئے اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ آپ نے شہری زندگی میں پائی جانے والی کشمکش کو بڑے سادہ انداز و الفاظ میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے حقیقی زندگی کے ترجمان بن کر اُبھرے۔ ان کے بعض افسانے حسین منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ سدرشن کے افسانوی مجموعے ''پارس اور پھول'' میں موجود کہانیاں خاص طور پر بچوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ آپ نے تقریباً ڈیڑھ سو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ ''شاعر''، ''دوسروں کی طرف دیکھ کر''، ''ایک نامکمل کہانی''، ''باپ''، ''مصور''، ''گورڈ'' وغیرہ ان کے عمدہ افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ سدرشن کے افسانوی مجموعے ''سدا بہار''، ''قوس قزح''، ''چندن''، اور ''طائر خیال'' وغیرہ ۱۹۳۶ء سے قبل شائع ہو چکے تھے۔

سدرشن کے برعکس اعظیم کریوی نے پریم منشی چند کی طرح اپنے افسانوں میں کسانوں کی حسرتیں، مایوسیاں اور ناکامیوں کو بڑے پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے اس کے ساتھ ہی انھوں نے گاؤں اور شہر کے بہت سے تہ دار گوشے نمایاں کرتے ہوئے اپنے افسانے تحریر کیے۔ اس کے علاوہ اعظم کریوی اپنے افسانوں میں اقتصادی، سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ رومان کو بھی شامل کرتے ہیں۔ آپ نے پریم چند کے انداز کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کے کئی پیچیدہ مسائل کو حقیقت پسندی کا جامعہ پہنا کر بڑے سلیقے سے قارئین کی نظر کیا۔ اس حوالے سے مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے۔

"اگر کوئی پریم چند کے اثر کو اپنے اندر جذب کر سکا ہے تو وہ اعظم کریوی ہے۔ ان کے افسانے بھی دیہات کی عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کافی بھر دیتے ہیں۔ ان کا دل حساس ہے اور ان کی نگاہ تیز اور رسا ہے۔ وہ واقعات کے نازک سے نازک امکانات اور جذبات کے لطیف سے لطیف میلانات کو محسوس کر کے بیان کر سکتے ہیں۔"(۷)

اعظم کریوی کے افسانوں میں دیہات کے پیچیدہ مسائل تو نظر آتے ہیں لیکن ان کے یہاں زندگی کی ترجمانی میں نفسیات کی گہرائی نظر نہیں آتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں قاری اپنی دلچسپی برقرار نہیں رکھ پاتا۔ ان کے مشہور افسانوں میں "ہیرو"، "کنول"، "لاج"، "انصاف"، "ایڈیٹر"، "گناہ کی گٹھڑی"، "بگلا بھگت"، "دکھیا مایا"، "پگلی" وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے بعد علی عباس حسینی کا نام افسانہ نگاری کے حوالے سے بے حد مشہور ہے۔ آپ بھی پریم چند کے خاص مقلدین میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شروع کی کہانیوں میں مثالیت پسند اصطلاحی نقطہ نظر واضح ہے۔ لیکن انھوں نے بہت جلد ہی عوام کے مسائل اور ان کی قومی اور معاشی بد حالی کو اپنا موضوع بنایا اور اس کے بعد ان کے افسانوں کا محور قومی یک جہتی، قدیم معاشرت اور ہندو مسلم اتحاد جیسے عنوانات ہیں۔ علی سردار جعفری اس حوالے سے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں۔

"انھوں نے دیہاتی زندگی کی اور درمیانی طبقے کے شریف خاندانوں کی بڑی اچھی تصویریں پیش کی ہیں۔ لیکن بعض فرسودہ اخلاقی اور سماجی قدروں نے جنھیں وہ کلیجے سے لگائے ہوئے ہیں، ان کی نگاہ اور فکر کو جکڑ رکھا ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کو بڑا افسانہ نگار بننے سے جس چیز نے روکا ہے وہ شاید ان کی نیم سرکاری ملازمت ہے۔ جس کے قیود کی انھیں مجبوراً پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اور میں نے محسوس کیا ہے کہ بہت جو کچھ وہ لکھنا چاہتے تھے نہیں لکھ سکے۔ اب یہ چیز ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ باوجود اپنے بہت سے اختلافات کے انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا۔"(۸)

اس کے علاوہ علی عباس حسینی کے اسلوب میں قلبی و جذباتی کرداروں کی مصوری، اور شیریں موجود ہے جس کی وجہ سے انھیں اُردو ادب میں مقبولیت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں افسانہ نگاری کا ایک خاص سلیقہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لکھنوی نثر کی جان دار روایت بھی ان کے افسانوں میں خاص طور پر نظر آتی ہے جو ان کے افسانوں کو ایک سادگی کرتی ہے۔ علی عباس حسینی نے تقریباً دو سو سے زائد افسانے تحریر کیے جن میں ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کا عکس واضح دکھائی دیتا ہے۔ "رفیق تنہائی"، "میلہ گھومنی"، "انسپیکٹر کی عید"، "باسی پھول"، "کڑوا گھونٹ"، "آئی-سی-ایس"، اور "ہمارا گاؤں" وغیرہ اہم افسانے ہیں۔

پریم چند کے افسانوی رجحان کے متوازی ایک اور رجحان بھی پروان چڑھا جو کہ رومان پسند اور لطیف ادب کے تخلیق کاروں سے منسوب ہے، جس کی داغ سجاد حیدر یلدرم نے بیلی اور لوگوں کو اُردو ادب میں رومانیت پسندی سے روشناس کروایا۔ اس رجحان کو فروغ دینے والوں میں نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، مجنوں گورکھ پوری، اور حجاب امتیاز علی کے نام بے حد اہم ہیں۔

اس رجحان کے زیرِ اثر یہ لوگ خالص رومانی اور تخلیقی افسانے تحریر کرتے رہے۔ یلدرم کے تحریر کردہ افسانوں کی بات کی جائے تو ان پر ترکی زبان و ادب اور ثقافت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ رومانیت اور تصوراتی دنیا کی سیر کراتے ہیں اور اپنی عمدہ تحریروں سے پڑھنے والے کے گرد ایک حصار قائم کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں انداز کے بارے میں امتیاز علی تاج "خیالستان" میں بیان کرتے ہیں۔

> "سید سجاد حیدر صاحب ہر جگہ موقعے کی مناسبت سے الفاظ استعمال کرنے میں بہت محتاط ہیں۔ کہیں وہ ایسے الفاظ تلاش کر کے لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں کہ جن کی اصوات ان کے معنی کا سراغ دیتی ہیں۔ کہیں آپ صرف ایک موزوں لفظ یا نفیس و نازک ترکیب سے فقرے میں زندگی کی لہر پیدا کر دیتے ہیں اور بعض اوقات ائتلاف کا ذہنی عمل بیدار کر کے پڑھنے والے کے معمولی تجربات و مشاہدات کو ایک عجیب دل کش روشنی میں پیش کرتے ہیں۔"(۹)

ان کے تحریر کردہ مشہور افسانوں میں "قلوپطرہ"، "میں جانتا ہوں"، "جہاں پھول کھلتے ہیں"، "قاہرہ کو دیکھ کر ایک مغنیہ سے التجا"، اور "ویرانے صنم خانے" وغیرہ مشہور ہیں۔

یلدرم کے بعد نیاز فتح پوری نے اس رجحان کو فروغ دیا۔ آپ کے تحریر کردہ افسانے خالص رومانی اور تاثراتی ہیں جس میں سکون اور خاموشی کی بجائے اضطراب اور ہیجان نظر آتا ہے۔ ان کے قلم کردہ مشہور افسانوں میں "نقاب اُٹھ جانے کے بعد"، "جمالستان"، "نگارستان"، "حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے"، "شبنمستان کا قطرہ گوہر"، اور "مختیارات نیاز" افسانوی مجموعے شامل ہیں۔ نیاز فتح پوری کے افسانے اپنی خالص اور رومانیت اور اسلوب بیان کی وجہ سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔

افسانوں میں رومانی رجحان کو فروغ دینے میں نیاز فتح پوری کے ساتھ ساتھ مجنوں گورکھ پوری کی خدمات بھی بے حد قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے محبت کو اہم مرکز بیان کر کے تخیلی اور رومانی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جگہ جگہ ناکامی، تلخی، گھٹن، مایوسی، بے وفائی، اور نامرادی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اس طرز کے افسانوں میں "خواب و خیال"، "محبت کی قربانیاں"، "محبت کا مزار"، "نقشِ ناہید"، "مدفنِ تمنا"، "محبت"، "شکستِ بے صدا"، "تم میرے ہو"، وغیرہ ہیں۔

سلطان حیدر جوش کی بات کی جائے تو ان کے افسانوں میں مقصدیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ جس سے ان کے فن کو کافی حد تک نقصان پہنچا۔ ان کے افسانوں کا اہم مقصد اور موضوع مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی اصلاح ہے۔ ان کا مقصد نئی تعلیم یافتہ سوسائٹی

کو مغرب کی اندھی تقلید سے بچانا ہے۔ اس لیے آپ ان کے خلاف اپنی تحریروں میں احتجاج بلند کرتے ہیں۔ سلطان حیدر جوش نے تقریباً اسیّ افسانے قلم بند کیے۔ ان کے اصلاحی افسانوں میں ''پھر بھی قید''، ''مساوات''، ''مادرزاد'' اور ''عالمِ رواح'' شامل ہیں۔ آپ نے پہلا افسانہ ۱۹۱۲ میں تحریر کیا۔

رومانی رجحان میں حجاب امتیاز کا نام بھی بے حد اہم جانا جاتا ہے ۔ ان کے افسانوں میں بھی رومانیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے اور افسانوی فضا محبت اور رومان سے بھری دکھائی دیتی ہے۔ حجاب امتیاز علی اپنے افسانوں میں استعارے وتراکیب، منفرد رومانی اندازِ نگارش، اور تراشی ہوئی تشبیہوں کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں سے ظاہر ہے کہ وہ مغرب کے رومان سے متاثر تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ طلسمی انداز بھی اپنی جھلک دکھاتا نظر آتا ہے۔ آپ کے بارے میں وقار عظیم تحریر کرتے ہیں۔

> ''حجاب امتیاز علی متوسط دور کے افسانہ نگاروں میں ایک طرز خاص کی موجد ہیں۔ انھوں نے اردو کو پر اسرار طلسمی انداز کے دلکش رومانوں سے آشنا کیا ایک زمانہ ایسا تھا جب پڑھنے والوں میں یہی طلسمی رومان یا قصہ کہانی کے ہر طرز سے زیادہ محبوب تھے لیکن پھر ایک زمانہ آیا جب دنیا زیادہ حقیقت پرست بن گئی اور ان تخیلی اور شاعرانہ رومانوں کی جگہ ایسے افسانوں نے لے لی جو زندگی کی کشمکش اور اس کی تلخیوں کی عکاس اور ترجمان تھے۔ لیکن حجاب اس دور میں بھی یہی پر اسرار اور طلسماتی رومان لکھتی رہیں اور پڑھنے والوں کا وہ طبقہ جو زندگی کی تلخیوں اور سختیوں سے گھبرا کر کبھی کبھی اپنے آپ کو کسی ایسی فضا میں گم کرنا چاہتا ہے جہاں تلخیوں کی یہ چھن کسی نہ کسی حد تک کم ہو جائے گی۔ اپنے آپ کو خود فراموشی میں مبتلا کر دینے کی خواہش انسان کو نئے نئے راستے دکھاتی ہے۔ انھیں راستوں میں سے ایک راستہ وہ ہے جو حجاب امتیاز علی کے افسانوں نے دکھایا ہے۔ ان کے افسانے اپنے زمانے کی سیاسی اور معاشرتی زندگی اور معشیت کے مسائل کے طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف تصور اور تخیل کی بنائی دنیا کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔''(۱۰)

پس حیدر ریلدرم کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی لطیف الدین احمد، ایم سلیم، مرزاادیب وغیرہ نے اُردو ادب میں رومان پسندی کو ایک خاص رجحان کے طور پر متعارف کروایا۔ جس نے اردو افسانے کی نشوونما میں ایک اہم کردار کی حیثیت اختیار کر لی۔

ان رومان پسند افسانہ نگاروں نے رومانوں انداز فکر، مایوسی، غم، دکھ، اُداسی وغیرہ کو زندگی کی بنیادی قدر قرار دیا۔ ان کی اس غم پسندی نے افسانوں کو بھی متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چیزیں اس دور کے افسانوں میں بھی خاص طور پر نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی غم جاناں کی یاد میں گھل گھل کر جان دینے کا رواج بھی اس دور کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

فکر و خیال کا اثر تکنیک پر ہوتا ہے۔ کیونکہ تکنیک بنیادی طور پر موضوع کے مطابق ہوتی ہے۔ رومانی میلان کا اثر چونکہ افسانوں کے موضوع پر ہوا اس لیے لازماً اس سے تکنیک بھی متاثر ہوئی۔ رومانوی اثرات کے تحت طلسمی فضاؤں میں افسانہ کی تکنیک کے اُصول مرتب کیے گئے۔ شدید قسم کی جذباتیت سے تکنیک میں سنسنی تاثیر پیدا ہوئی۔ اس لیے کیفیات و محسوسات کی برتری سے افسانہ کی زبان کیفیات کی زبان بن گئی۔ افسانہ نگار شاعروں کی طرح تشبیہوں اور استعاروں میں باتیں کرنے لگے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں۔ کہ رومانی میلان نے افسانوی قدروں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رومانی میلانات کے بغیر اس دور کے افسانوں میں موضوعات اور تکنیک کا مطالعہ ممکن نہیں۔

تاہم یہ رومان پسند افسانے صرف کچھ عرصہ ہی اُردو کے اُفق پر چھائے رہے اور جلد ہی اپنا اثر کھو گئے۔ اس کی وجہ افسانے میں موجود روایت لذت و انبساط کا وقتی تاثر تھا جو کہ زندگی کی حقیقتوں سے بہت دور تھا۔ اسی لیے رومانیت کا یہ رجحان ادب میں ایک وقتی شعلہ اور افسانوی تاریخ کا ایکا ہم حصہ بن کر رہ گیا۔ یلدرم کے رومانی اور پریم چند کے اصلاحی میلان کی یہ صورت حال ۱۹۳۰ء تک کم و بیش چلتی رہی۔

۱۹۳۰ء کے بعد اردو افسانہ کو روسی فرانسیسی، انگریزی اور جاپانی زبان کے افسانوں کے تراجم سے بڑی وسعت ملی۔ ان ترجموں نے اردو افسانہ نگاروں کو بھی متاثر کیا اور انھیں موضوع کا انتخاب، پلاٹ کی تعمیر، کردار نگاری کا شعور، ڈرامائی اختتام تکنیک کے تنوع اور مقصدیت کی طرف متوجہ کیا۔ جن مترجمین نے مغربی اثر قبول کیا ان میں سرِ فہرست، پروفیسر مجیب منصور احمد، حیات اللہ انصاری، شاہد دہلوی، خواجہ منظور حسین جلیل احمد قدوائی اور عبد القادر سروری شامل ہیں۔

اُردو افسانے کے پسِ منظر کو دیکھتے ہیں تو اس کی روایت میں ایک بڑی تبدیلی ۱۹۳۲ء میں ''انگارے'' کی اشاعت سے آئی۔ ''انگارے'' نے اُردو ادب میں افسانے کو ایک نیا رُخ اور نظر یا دیا۔ ''انگارے'' میں بین الاقوامی انتشار سے متاثر نوجوانوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سے ایسا دھماکہ کیا جس سے افسانے نے ایک نئی سمت اختیار کر لی۔

''انگارے'' ایک دس افسانوں پر مشتمل ایک کتاب ہے جس میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے ''نیند نہیں آتی''، ''جنت کی بشارت''، ''گرمیوں کی ایک رات''، ''دلاری''، ''پھر یہ ہنگامہ'' شامل ہیں۔ اس میں رشید جہاں کا ایک افسانہ ''دلی سیر'' موجود ہے۔ جبکہ

ایک ڈرامہ "پردے کے پیچھے" شامل ہے۔ اس کے علاوہ محمود الظفر کا ایک افسانہ "جواں مردی" اور احمد علی کے دو افسانے "بادل نہیں آتے" اور "مہاوٹوں کی ایک رات" شامل ہیں۔

ان افسانوں میں خاص طور پر مذہبی و سماجی تنقید، رومانی انقلاب پسندی، جدید نفسیاتی معنویت، جنسی گھٹن اور ڈرامائی اسلوب کی آمیزش نظر آتی ہے۔ انگارے میں موجود تمام افسانے مارکسزم اور فرائڈ کے تصورات سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے۔ اس حوالے سے آل سرور احمد لکھتے ہیں۔

> "انگارے کے مصنفین نفسیاتی نقطہ نظر سے فرائڈ، فنی نقطہ نظر سے جیمس جوائس، اور معاشی نقطہ نظر سے کارل مارکس کے مقلد تھے۔"(۱۱)

مصطفٰے حسین اپنے مضمون "اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات" میں بیان کرتے ہیں۔ "انگارے کے افسانے ہمارے افسانوی ادب میں پریم چند کے افسانوں کے بعد دوسرے اہم موڑ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔"(۱۲)

انگارے کو موضوعات اور تکنیک کے اعتبار سے جہان نو کا پیغامبر کہا گیا ہے۔ کسی نے اسے فنی جسارت، صاف گوئی اور بے باکی کا آئینہ کہا تو کسی نے اُسے جدید ترین افسانہ نگار کی بنیاد قرار دیا۔۔ اس بارے میں وقار عظیم لکھتے ہیں۔

> "موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اُردو افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی کہیں نہیں ملتی اور دن کے لحاظ سے اتنی نازک پیچیدگیاں۔ انگارے کے افسانہ نگاروں نے ہندوستانیوں کی مختلف جماعتوں کے راسخ عقیدوں کے خلاف ایسی باتیں کہیں۔ جنھیں لوگ اب تک تکلیف اور جھجھک محسوس کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اب تک کی زندگی کے جن پہلوؤں کو دیکھ کر وہ دانستہ ان کی طرف سے چشم پوشی اختیار کر رکھی تھی۔ انگارے کے افسانہ نگاروں نے نئی جسارت سے کام لے کر ان پر روشنی ڈالی اور اس طرح پردہ داری کے فرسودہ مسئلہ کو چھوڑ کر پردہ داری کا شیوہ اختیار کیا۔ اس لیے ان افسانوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موضوع اور فن دونوں کے اعتبار سے انھوں نے پڑھنے والوں کو ان گنت دھچکے دیئے اور اور اب یہ طرز داروں کے افسانوں کا ایک عام اور مقبول ترین طرز بن گیا ہے۔"(۱۳)

اس میں موجود افسانہ نگاروں نے خاص طور پر ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جو کہ اس وقت ادب سے باہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی نظر میں یہ مجموعہ سخت ناپسندیدہ تھا اس لیے اسے چند مہینے بعد ہی ضبط کر لیا گیا۔ "انگارے" کے افسانوں کے حوالے سے خلیل الرحمٰن اعظمی بیان کرتے ہیں۔

"یہ افسانے دراصل اس کرب اور جھلاہٹ کی پیداوار ہیں جو اس دور کا نوجوان بندھے سکے اخلاقی و معاشرتی قوانین اور اس سے پیدا شدہ تلخیوں کے خلاف محسوس کر رہا تھا۔ ان افسانوں میں لب ولہجہ کہیں کہیں پھکڑ پن اور مسخرگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ جھوٹی مذہبیت، ریاکاری، تہذیب و شائستگی کا سوانگ، وطن پرستی اور قوم پرستی کے ڈھونگ ان سب پڑ انگارے کے مصنفین اپنے طنز کے تیر برساتے ہیں۔ ان افسانوں میں جوانی کا جوش اور ہر چیز کو تہس نہیں کر دینے کا جذبہ ہے اور یہ جذبہ کبھی بھی اعتدال سے اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ ان کے مکالموں اور فقروں میں ابتذال اور عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں کا ردعمل شدید ہوا جس کے نتیجے میں یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔ پھر بھی اس مجموعے میں سجاد ظہیر کا افسانہ دلاری ایک تعمیری نقطہ نظر رکھتا ہے اور سماج میں عورت کے متعلق پہلی بار بعض ایسی پیچیدگیوں کی طرف نشاندہی کرتا ہے جسے آگے چل کر بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنا مرکز بنایا اور نفسیاتی مطالعے اور حقائق کے اسباب و علل کا تجزیہ پیش کر کے اس اہم موضوع کو برتنے کی کوشش کی۔ احمد علی کے افسانے بادل نہیں آتے ہیں، عریانی اور بے باکی کی حد سے زیادہ ہے۔ ان کا دوسرا مہاوٹوں کی ایک رات انقلابی حقیقت نگاری کا ایک نمونہ ہے۔ اس میں مصنف نے مفلسی اور اس کے دردناک نتائج کو سماجی اور معاشرتی مسائل سے منسلک کر کے ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ رشید جہاں کا افسانہ دلی کا سیر عورت کی سماجی آزادی پر ایک مضمون نما کہانی ہے اور محمود الظفر کا افسانہ جواں مردی مرد کے جھوٹے پندار پر طنز ہے۔ پلاٹ سے مکمل آزادی اور باغیانہ خیالات کا اظہار سجاد ظہیر کے افسانہ نیند نہیں آتی، میں ہوا ہے۔ یہ سارے افسانے فنی اعتبار سے عام ہیں لیکن ان کی اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پہلی بار ہمارے افسانہ نگاروں نے اس بند کو توڑنے کی کوش کی جس کی وجہ سے سماج کے بہت سے اہم اور پیچیدہ مسائل ابھی تک فن کی حدود میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ یا شجرِ ممنوعہ قرار دیے جاتے تھے۔(۱۴)

گو کہ "انگارے" میں موجود افسانوں نے حقیقت پسند کی راہیں ہم وار کیں تاہم ان افسانوں میں فن کا خیال اور پختگی موجود نہیں تھی۔ خالد علوی کی مرتب کردہ کتاب "انگارے" میں احمد ندیم قاسمی دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"انگارے کا ادبی معیار کچھ بھی ہو مگر مختلف افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا وہ مجموعہ ہے، جس نے صرف افسانے کی دنیا میں بلکہ تخلیق فن کی جملہ اصناف میں انقلاب برپا کر دیا تھا، جو ایک مختصر عرصے کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک کی صورت میں برصغیر کے ہر چہار طرف رواں ہو گیا۔"(۱۵)

''انگارے'' نے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیلی۔ جس میں سجاد ظہیر نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ کیوں کہ وہ اس تحریک کے پیش رو تھے۔ سجاد ظہیر کے افسانوں میں ترقی پسندی اور حقیقت نگاری نمایاں ہے۔ ''انگارے'' کے افسانوی مجموعے میں شامل سجاد ظہیر کا افسانہ نیند نہیں آتی، مکمل طور سے جیمز جوائس سے متاثر ہو کر شعور کی رو کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس تکنیک کا صحیح ڈھنگ سے استعمال پہلی بار سجاد ظہیر نے ہی کیا اور اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے آشنا کرایا۔

اس کے علاوہ انھوں نے افسانہ "دلاری" کے ذریعے سے معاشرے کو ایک نیا نظریہ دیا۔ اس افسانے میں موجود مرکزی کردار ایک لونڈی ہے، جو ہمارے معاشرے میں شامل ہو کر بھی شامل نہیں ہے۔ اس افسانے میں اعلی طبقہ کو ایک لونڈی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ '' روشنائی'' ان کی سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں بیمار (ڈرامہ) لندن کی ایک رات (ناولٹ)، نقوش زنداں، (خطوط)، ذکر حافظ، (تنقید) پگھلا نیلم (شاعری) مضامین سجاد ظہیر اردو ہندی ہندوستانی وغیرہ شامل ہیں۔

سجاد ظہیر کے بعد انگارے کے حوالے سے رشید جہاں کا نام بھی بے حد اہم ہے۔ ان کا اس مجموعے میں ایک افسانہ اور ایک ڈرامہ شامل ہے جس کی وجہ سے ان کی بے حد مخالفت کی گئی اور انھیں کافی زیادہ شہرت و مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ تاہم رشید جہاں کے یہاں روایت سے انحراف نہ صرف زیریں سطح پر ہے بلکہ شدت کے ساتھ الفاظ کی سطح پر بھی منعکس ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ رشید جہاں نے خاص طور پر عورتوں کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور خواتین سے متعلق معاشرے میں پھیلی تمام برائیوں کے خلاف احتجاج بلند کرتے ہوئے اپنا قلم اُٹھایا۔ آپ کے افسانوں میں ٹکسالی اندازِ بیان نظر آتا ہے۔ مختصر اور براہ راست سادہ افسانوں میں آپ نے سب سے پہلے مسلم عورتوں کی گھریلو بول چال کو استعمال کیا۔ آپ نے تقریباً ۳۰ افسانے، ۹ ڈرامے، اور ۶ مضامین تحریر کیے۔

ترقی پسند افسانہ نگاری میں احمد علی کی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں دہلی کی بول چال اور روزمرہ کے محاوروں کا استعمال نظر آتا ہے۔ ''انگارے'' کے بعد ان کے چار افسانوی مجموعے ''شعلے''، ''ہماری گلی''، ''قید خانہ''، اور ''موت سے پہلے'' شائع ہوئے۔ آغاز میں احمد علی نے بھی خواتین کے مسائل اور دہلی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے کئی انگریزی ناول لکھے اور اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔

''انگارے'' میں موجود افسانہ ''جواں مردی'' کے بعد محمود الظفر نے ایک ڈرامہ ''امیر کا محل'' تحریر کیا جو غالباً ان کی آخری تحریر ہے۔ اگر غور کیا جائے تو فنی اعتبار سے محمود الظفر کے بعد کے تحریر کردہ افسانے زیادہ معیاری نظر آتے ہیں۔ آپ نے کئی افسانے لکھے جن ''مارچ کی میں ایک رات''، ''میرا کمرہ'' اور ''ہماری'' وغیرہ شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''انگارے'' کا منظر عام پر آنا ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کی ضبطی ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سبب بنا۔ جس کے رد عمل میں انگلینڈ میں انجمن ترقی پسند مصطفین کی بنیاد

رکھی گئی جس کے روح رواں سجاد ظہیر تھے۔ لکھنو میں اس انجمن کا پہلا اجلاس ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی زیر صدارت ہوا۔ جس میں پریم چند نے ادب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا اس کے پیچھے ان کے تمام عمر کا پختہ ادبی شعور تھا۔ جن کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا۔

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں بلکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''(۱۶)

ترقی پسند تحریک کے منشور کے تحت لکھنے والے افسانہ نگاروں کی بڑی لمبی قطار موجود ہے۔ ترقی پسند تحریک کے اس عہد کو اردو افسانے کا ''عہد زریں'' بھی کہا گیا ہے کیوں کہ اس عہد میں ذہین اور باصلاحیت ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے افسانے کو ذریعہ اظہار بنایا اور بہترین افسانے تخلیق کیے۔ جن میں راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، سہیل عظیم آبادی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے نام اس دور کی نمایاں دین ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے اس دور میں موضوع اور فن دونوں کو اہمیت انھیں لوگوں کے ذریعے سے ملی۔ جب ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں نے اسے اپنے تجربہ کا حصہ بنایا تو اردو افسانہ تو اُردو افسانے کو صحیح معنوں میں عروج حاصل ہوا۔ ان ترقی پسند افسانہ نگاروں کا اہم مقصد معاشرے کی اصلاح تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ادب برائے زندگی کے ساتھ ساتھ ادب برائے انقلاب کے بھی قائل نظر آتے ہیں اور کسی بھی فرد سے زیادہ معاشرہ کو اہمیت دیتے ہیں۔

انسانی زندگی میں پیش آنے والے نئے مسائل خارجی عوامل، انقلابات، حب الوطنی، قومی یک جہتی، طبقاتی کشمکش، سماجی انتشار، اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن، رجعت پرستی جنسی گھٹن، طبقہ نسواں کی زبوں حالی، مزدوروں، کسانوں اور پس ماندہ طبقات کے مسائل جیسے موضوعات کا عکس اس دور کے ہر افسانہ نگار کے یہاں نظر آتا ہے۔ ترقی پسند نقاد عزیز احمد کا اس بارے میں خیال تھا۔

> ''یہ انگارے سماج پر پہلا بڑا وحشیانہ حملہ تھا اور اگرچہ اس حملے میں غیر ضروری خونریز بھی بہت تھی۔ جس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کئی سال تک پنپ نہ سکی۔''(۱۷)

اس عہد میں حقائق اور عصری مسائل کو پیش کرنے کے لئے اسلوب و فن کے پیرائے ایجاد کیے گئے جس سے اردو افسانہ میں مختلف اسالیب نمودار ہوئے۔ اردو افسانے کی اس نئی روایت میں پریم چند کی حقیقت نگاری و دردمندی، رومانی افسانہ نگاروں کی آزاد خیالی اور انگارے کے مصنفین کی بے باکی و جرات مندی شامل تھی۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں۔

"ایک جانب مغربی افسانوں کے اعلیٰ نمونے تھے دوسرے جانب ''انگارے'' کی انقلاب انگیز کہانیاں، تیسری طرف پریم چند کا ہر لحظہ بڑھتا ہوا فی ادراک تھا اور چوتھی جانب ہندوستان کی بے قرار فضا تھی جو مکمل آزادی کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کے نعروں سے لبریز تھی، ان سب نے مل کر اس تحریک کو جنم دیا جسے عام طور پر ترقی پسند تحریک کہا جاتا ہے۔ اس تحریک نے ابہام، عدم مقصدیت اور زندگی سے بے تعلقی پر ضرب لگا کر ادب کو نیا خون دیا۔''(۱۸)

اپنے عہد کی زندگی کے مختلف مسائل ور جحانات کی ترجمانی ان افسانہ نگاروں نے بڑی عمدگی کے ساتھ کی ہے۔ پریم چند اور ''انگارے'' کے مصنفین نے افسانے کو سماجی حقیقت نگاری کی جس روایت کو استوار کیا اس کی توسیع ترقی پسند تحریک سے متاثر افسانہ نگاروں کے ذریعے ہوئی۔ انگارے کے افسانہ نگار سجاد ظہیر اس ترقی پسند تحریک کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔

''انگارے کی مشترکہ کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت برستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔''(۱۹)

''انگارے'' کی یہی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے اس کے افسانے موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے ناکام ہو گئے، رشید جہاں محمود الظفر اور سجاد ظہیر میں افسانہ نگاری بالکل صلاحیت ہی نہیں البتہ احمد علی میں ایک افسانہ نگار کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ لیکن وہ بھی اس توڑ پھوڑ اور انتہا پسندی کا شکار ہو گئے۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی لکھتے ہیں۔

''یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ 'انگارے' کے لکھنے والوں نے اُردو کے افسانے نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا۔''(۲۰)

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں سب سے قد آوار شخصیت کی بات کی جائے تو وہ کرشن چندر ہیں۔ آپ اس دور کے بے حد مشہور افسانہ نگار ہیں جو جذباتی رومان پرست اور شاعرانہ شخصیت کے مالک ہیں۔ کرشن چند حسن کے شیدائی تھے اس لیے نسوانی اور قدرتی دونوں طرح کے حسن سے رنگ و نور چُرا کر اپنے افسانوں کی تخلیق کرتے۔ اور اپنی دل کش اور بہترین اسلوب کے ذریعے سے اپنی کہانیوں کو تابناکی عطا کرتے۔ ان کے اسلوب میں موجود ناز کی اور حسن کی کیفیت انہیں افسانے کا سب سے بڑا شاعر بناتی ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں عشق کے جذبات رومانی سرمستی و سرشاری کے ساتھ ہی درد کی کسک اور غم کی حرارت کا احساس بھی موجود ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دردمندی کا یہ عنصر ہی کرشن چندر کی کہانیوں کی شناخت ہے۔ انھوں نے سماج کے مظلوم اور ستائے ہوئے طبقے کے درد و کرب کو اپنا موضوع بنایا اور اپنی جذباتی شیریں اور رنگین زبان میں ان کے مسائل کو بڑے زہر ناک انداز میں

بیان کیا ہے۔ ''طلسم خیال'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے یہ عوام میں بہت مقبول ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''نظارے'' ہے جس کے افسانے طلسم خیال کے افسانوں کے مقابلے میں فنی اعتبار سے زیادہ پختہ ہیں۔ ''کالو بھنگی''، ''ان داتا''، ''غالیچہ''، ''مہا لکشمی کا بیل''، اور ''آدھے گھنٹے کا خدا'' وغیرہ ان کے وہ افسانے ہیں جن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ احتشام حسین فرماتے ہیں:

> ''نئے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر سے زیادہ کسی کے مشاہدے نے مناظر سے اتنا رس نہیں نچوڑا ہے۔ کسی نے اسے انسانی فطرت اور کائنات کے رشتے میں دیکھنے کی اتنی کوشش نہیں کی ہے۔ کشمیر، گلبرگ اور جہلم انسانوں کے کردار نہیں بن گئے ہیں بلکہ بالکونی، نگڑا اور وادی بھی شدت تاثر کی وجہ سے کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔''(۲۱)

اس کے علاوہ کرشن چند کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت طنز و مزاح ہے، جس کا استعمال وہ محض ضرورت کے وقت ہی کرتے تھے۔ گو کہ انھوں نے مزاحیہ افسانے بھی قلم بند کیے۔ لیکن ان کے سنجیدہ افسانے بھی مزاح سے بھرپور تھے۔ ان کے مزاحیہ افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ہوائی قلعہ'' ہے۔ جس میں انہوں نے زندگی، سماج اور معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔ یہ افسانہ کرشن چند کے گہرے شعور کا پتہ دیتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کا شمار صف اول کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ افسانہ نویسی کے فن کی بات کی جائے تو اس پر ان کی مکمل دسترس ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا۔ بیدی نے زندگی کا گہرا مشاہدہ اور انسانی فطرت و نفسیات کا مطالعہ گہرائی سے کیا تھا جس سے ان کے افسانوں میں وہ فنی ندرت، ذہانت اور سماجی شعور پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کے ذہن پر دیر پا اثر چھوڑتی ہے۔

بیدی نے عورت کے تقدس اور اس کی انا پر متعدد افسانے لکھے ہیں۔ انھوں نے تغیر پذیر معاشرے میں طبقاتی کشمکش اور اس کے ذہنی کرب و ہیجان کو فکر و فلسفہ اور منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے سماج کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو فنی چابک دستی سے قاری کے روبرو پیش کیا ہے۔ وہ زندگی کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں اور سماج کے مشکل مسائل کو سلجھانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں پنجاب کے دیہات کی تصویر کشی، نفسیات کی پیچیدگیاں پس ماندہ اور اوسط طبقے کی زندگی میں رونما ہونے والے نشیب و فراز، رسم و رواج کی بندشیں اور مفلسی میں عظمت کا احساس جیسے موضوعات گہری فکر کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بقول وقار عظیم:

> ''بیدی کے نزدیک ہر انسان کے ہر عمل کی نفسیاتی تاویل اور جذباتی تحلیل کی جاسکتی ہے۔ عموماً اس فلسفیانہ خیال کو تخلیقی ادب میں اپنا رہنما بنانے میں دو اندیشے ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی خشکی اور شاعری کی مبالغہ آمیزی و رنگینی۔ لیکن بیدی نے ہر جگہ اس بے رنگی و رنگینی سے اپنا دامن بچایا ہے۔ ان کے کردار زندگی کی حدوں سے ایک قدم بھی آگے

نہیں نکلتے۔ ان کی نفسیاتی یا جذباتی زندگی بیرونی حالات کی پیدا کی ہوئی ہے، واقعات اور کرداروں میں برابر ایک گہرا اور بامعنی ربط ہے۔ واقعات ہی انسان کو تخیل اور فکر پر آمادہ کرتے ہیں اور وہی کسی نہ کسی عمل کی طرف لے جاتے ہیں۔ انھیں سے گذری ہوئی زندگی کی یادیں وابستہ ہوتی ہیں اور اس کے لئے کسی کردار کو اس کے بیرونی ماحول سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔"(۲۲)

پس ان افسانہ نگاروں کی کوششوں سے ہی اُردو افسانے کا دائرہ پھیلتا گیا اور اس کی گرفت میں انسانی نفسیات اور جنس بھی آجاتی ہے۔ اس لیے افسانہ صرف خارجہ صداقتوں کا ترجمان ہی نہیں رہا بلکہ داخلی حقیقتوں کا مظاہر بھی بن جاتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ طارق چھتاری، جدید افسانے اُردو ہندی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص:۱۳۔
۲۔ فرمان فتح پوری، اُردو کا افسانوی ادب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص:۱۲۱۔
۳۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۲۰ء، ص:۳۷۔
۴۔ فرمان فتح پوری، اُردو کا افسانوی ادب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص:۱۲۲۔
۵۔ ہفتہ وار **ہماری زبان**، انجمن ترقی اُردو ہند، فروری، ۱۹۷۵ء۔
۶۔ فرمان فتح پوری، اُردو نثر کا فنی ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص:۲۷۔
۷۔ طارق چھتاری، جدید افسانے اُردو ہندی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص:۲۱۔
۸۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص:۱۶۷–۱۶۸۔
۹۔ گوپی چند نارنگ (مرتب)، بیسویں صدی میں اُردو ادب، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص:۱۴۴۔
۱۰۔ وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص:۲۰۱–۲۰۲۔
۱۱۔ آلِ سرور احمد، تنقیدی اشارے، ص:۳۴۔
۱۲۔ محمد حامد، اُردو افسانے کا ارتقاء، ریڈر شعبہ اُردو، راجندر کالج چھپرہ، ۱۹۸۶ء، ص:۱۷۷۔
۱۳۔ وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص:۶۷–۶۸۔
۱۴۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص:۱۸۱۔
۱۵۔ خالد علوی، انگارے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص:۷۔
۱۶۔ جمال آرا نظامی، مختصر افسانے کا ارتقاء (پریم چند تا حال)، جاپان ہاؤس، میرس روڈ، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص:۱۸۷۔
۱۷۔ محمد حامد، اُردو افسانے کا ارتقاء، ریڈر شعبہ اُردو، راجندر کالج چھپرہ، ۱۹۸۶ء، ص:۱۸۰۔
۱۸۔ احتشام حسین، عکس اور آئینے، ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء۔

۱۹۔ محمد حامد، اُردو افسانے کا ارتقاء، ریڈر شعبہ اُردو، راجندر کالج چھپرہ، ۱۹۸۶ء، ص:۱۸۰۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ احتشام حسین، روایت اور بغاوت، ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء، ص:۱۲۸۔

۲۲۔ وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ص:۹۷۔

کتابیات:

۱۔ آلِ سرور احمد، تنقیدی اشارے، ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء۔

۲۔ احتشام حسین، عکس اور آئینے، ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء۔

۳۔ احتشام حسین، روایت اور بغاوت، ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء۔

۴۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، انجمن ترقیِ اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء۔

۵۔ خالد علوی، انگارے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء۔

۶۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء۔

۷۔ جمال آرا نظامی، مختصر افسانے کا ارتقاء (پریم چند تا حال)، جاپان ہاؤس، میرس روڈ، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء۔

۸۔ گوپی چند نارنگ (مرتب)، بیسویں صدی میں اُردو ادب، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۲ء۔

۹۔ طارق چھتاری، جدید افسانے اُردو ہندی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء۔

۱۰۔ فرمان فتح پوری، اُردو کا افسانوی ادب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۳ء۔

۱۱۔ فرمان فتح پوری، اُردو نثر کا فنی ارتقاء، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء۔

۱۲۔ محمد حامد، اُردو افسانے کا ارتقاء، ریڈر شعبہ اُردو، راجندر کالج، چھپرہ، ۱۹۸۶ء۔

۱۳۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۲۰ء۔

۱۴۔ وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء۔

۱۵۔ ہفتہ وار ہماری زبان، انجمن ترقیِ اردو ہند، فروری، ۱۹۷۵ء۔

☆☆☆☆☆